چھتیسواں سفر ۔ پھر پاکستان

جس طرح ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد ہم نے ہندوستان کے یکے بعد دیگرے سفر کئے، اسی طرح امریکہ سے پاکستان بھی مستقل آنا جانا رہا۔ حد یہ ہے کہ دوسرے لوگوں نے کہا کہ ان کے لئے امریکہ جانا تو ایسا ہو گیا جیسے کہ ہم لالوکھیت جا رہے ہوں۔ ہوا یوں کہ ہماری سب سے چھوٹی بیٹی روبی اور بیٹے قمر جو لندن سے آئے تھے، السو برانتے میں عید کر کے پاکستان واپس چلے گئے تھے۔ اب ہم لندن سے آ کر ابھی امریکہ میں صحیح بیٹھے بھی نہیں تھے کہ اگست میں پھر پاکستان جانا پڑ گیا کہ چل کر دیکھیں کہ پاکستان میں روبی کا کیا حال ہے۔ پھر یہ بھی خیال تھا کہ شاعری کے کلام جمع ہو گئے تھے اور اب انہیں کتاب کی صورت میں شائع کروانا تھا۔ یہ سب سوچ کے ہم ۱۸/اگست ۱۹۹۵ء کو ہم پھر پاکستان روانہ ہو گئے۔

ہم نے پھر پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز سے نیویارک کے راستے پرواز لی۔ اس پرواز پر ہمارے برابر ایک خاتون بنام سلطانہ صدیقی بیٹھی تھیں جو کراچی میں ہیومن رائٹس، یا انسانی حقوق کے ایک ادارہ کے لئے ادارے کی سیکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہی تھیں۔ یہ اچھا عہدہ تھا اور یہ سیکریٹری وہ نہیں جو کہ کلرک کی طرح ہوتی ہیں، بلکہ یہ ادارہ کی سیکریٹری تھیں۔ ہم نے اُن سے پوچھا کہ وہ عورتوں کے لئے کیا کر رہی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ ''ہمارے ادارے نے اکثر اخباروں میں اندرونِ سندھ اور کراچی کی کیفیت اور عورتوں کے ساتھ گھروں میں شوہروں اور والدین کے بُرے برتاؤ کی تفصیل شائع کی ہے، لیکن قانون ٹس سے مس نہیں ہوا۔ لوگ خود پولیس اور عدالت سے رجوع کرتے ہوئے گھبراتے ہیں''۔ ہم نے بھی اُن کی بات سے

اختلاف نہیں کیا کہ ہمارا بھی یہی خیال تھا۔ ہم نے انہیں اپنے تجربات بتائے۔ فیڈرل کیپیٹل ایریا کا واقعہ ہمیں یاد تھا کہ ایک عورت کو بس ڈرائیور اور کنڈکٹر نے کچھ غلط باتیں کہیں تھیں جس کی شکایت اُن صاحبہ نے اپنے شوہر سے کی، اور پھر وہ دونوں واپس بس اسٹاپ پر آئے اور پہلے کچھ احتجاج کیا اور بات بس کے اس آخری اسٹاپ کے اڈّے کے ٹھیکیدار تک پہنچی تو تمام بس ڈرائیوروں نے بسیں دوڑا دوڑا کر اُن صاحبہ اور اُن کے شوہر کو کچل کر وہیں ختم کر دیا۔ اخباروں نے شور مچایا لیکن بسوں کی مافیا کے آگے صحافی کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح ۱۹۸۴ء میں جب ہم معمار اپارٹمنٹس میں رہتے تھے تو جب بھی پولیس والے ٹھیلے والوں کو ہٹانے آتے، وہ پہلے ہی ٹھیلے اپارٹمنٹس کے احاطے میں چھپا کر رکھ دیتے تھے۔ ہمارے چوکیدار نے بتایا تھا کہ یہ لوگ پولیس والوں کو ۵۰ روپیہ ماہانہ ادا کرتے تھے، اور ہر مہم والے دن پولیس والے اپنا ایک آدمی پہلے ہی بھیج کر انہیں بتا دیتے تھے۔ ہمارے اپنے شوہر کا انتقال ایک ایسی چوٹ سے ہوا جو ان پر ایک جیب کترے نے لگائی تھی۔ خود سول ہسپتال کے ڈاکٹروں نے پولیس کو یہ بات بتانے سے انکار کر دیا کہ ان کے تمام تجربے میں پولیس خود مجروح کے خاندان سے بھتہ لینے آنے لگتی ہے اور ہسپتال کے عملے کو بھی بہت تنگ کرتی ہے، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ مجرم پکڑا جائے کہ اکثر عادی مجرم پولیس والوں کے دوست ہی ہوتے ہیں۔ ہم نے خود ایک مجسٹریٹ کو ۲۵۰۰۰ روپیہ رشوت لیتے دیکھا اس لئے کہ وہ ایک ٹرک اڈّے کے مالک کے خلاف ایک ٹرک کمپنی کے حق میں فیصلہ دے۔ اب اس صورت میں واقعی انسانی حقوق کی بات کیا کرنا۔ انہی باتوں میں وقت گزر گیا اور پائلٹ کی طرف سے کراچی ایئرپورٹ پر جہاز اترنے کا اعلان ہونے لگا۔ باہر جھانک کر دیکھا تو دل باغ باغ ہو رہا تھا ملیر ہالٹ کی ان خشک جگہوں کو دیکھ کر۔ باہر آئے تو دل دھک سے ہو گیا کہ اپنا سامان لے کر آپ پارکنگ لاٹ تک جائیں کیونکہ حفاظتی قانون کے مطابق ایئرپورٹ تک کار نہیں لا سکتے تھے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ کہیں ٹرالی کو لے کر جائیں کیونکہ سڑک اور فٹ پاتھ یہ سوچ کر تو بنائے ہی نہیں گئے تھے۔ نتیجتاً دو مزدور کئے جو سامان اٹھا کر کار تک لائے، ہمیں لگا کہ ہم ریلوے اسٹیشن کے قلیوں کے ساتھ جا رہے ہوں۔

گھر پہنچے تو ہر طرف اونچے اونچے فلیٹ کی عمارتیں بن رہی تھیں، باہر اشتہاری تختوں ('سائن بورڈ') پر ان کی خوبیاں لکھی تھیں، اور ان اشتہاری تختوں کے نیچے پورے محلے کا کوڑا پڑا ہوا تھا۔ ہر طرف دھواں اور گرد، اور پھر ایک آدھ جگہ بندوق کی گولیوں کے نشان۔

اس کے بعد کے کئی ماہ امروہہ مرکز کے مختلف میلوں اور مشاعرہ سے گہما گہمی رہی۔ یہاں پروین شاکر، زاہدہ حنا، شاہدہ حسن، ثریا نقوی، بیگم سید اور سلطانہ مہر ہر سال شریک ہوتے رہے۔ امروہہ کی برادری اب بہت بڑھ چکی تھی اور مرکز میں اب اسکول بھی تھا اور شادی گھر بھی۔ گرچہ شہر کے ہنگامی حالات کی وجہ سے یہاں کے میلے، مشاعرہ کم ہو گئے تھے، لیکن پھر بھی ہر ہفتہ کچھ نہ کچھ ہوتا تھا۔ بس یہ تھا کہ شام کو جلدی جلدی سب محفل برخواست کہ اوّل شام ہی گھر واپس ہونا پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک ڈرامہ، لاٹری، اور نمائش کے ساتھ مختلف کامیاب طالب علموں کو انعام دینے کا انتظام تھا۔ ہم نے لاٹری کا انتظام اور اس میں دیانتداری سے انعام کی ذمہ داری اپنے حصّہ میں لی اور اسی میں مصروف تھے کہ ایک طرف انعام بٹنا شروع ہو گئے اور ہماری بیٹی رعنا کا نام پکارا گیا۔ رعنا نے ایم اے میں کراچی یونیورسٹی میں اعلیٰ معیار سے امتحان میں کامیابی لی تھی اور اس وجہ سے انہیں بھی انعام دیا جانا تھا۔ رعنا تو ابھی بھی امریکہ میں تھیں لہذا ہم یہ انعام لینے اسٹیج پر گئے۔ انعام دینے والی امروہہ کی ایک بزرگ خاتون تھیں جنہیں سب بجیا کہتے تھے۔ اب ہم اوپر گئے تو بجیا نے ہمیں گلے لگا لیا اور بولیں، ''آپ نے اس عمر میں بڑی ہمت کی ہے ڈگری لے کے، مبارک ہو''۔ ہم نے انہیں اور ناظرین کو حقیقت بتائی تو ساری محفل ہنس پڑی۔

اس تھوڑے عرصے میں امریکہ میں رعنا نیویارک بھی ہو آئیں اور ٹیکساس بھی، کہ ان کے شوہر واپس پاکستان نیشنل شپنگ کارپوریشن میں کام شروع کر کے امریکہ آئے تھے۔ جب ان کا جہاز نیویارک میں لگا تو رعنا وہاں پہنچ گئیں اور ان کے ساتھ وہیں رہیں۔ اب جب یہ نیویارک سے ہوسٹن جانے لگے تو رعنا واپس کیلیفورنیا آ گئیں۔ پھر وہی جہاز جب ہوسٹن میں لگا تو رعنا پھر ہوسٹن چلی گئیں۔ لگتا تھا کہ ہماری سفر والی بیماری اُنہیں لگ گئی ہو۔ دوسری طرف رعنا اپنے جسمانی علاج کے خاتمے کے بعد مکمل شفایابی کی خبر سن کر پاکستان چلی گئیں اور انہوں نے الائیڈ بنک میں اپنا کام دوبارہ سنبھال لیا۔

کراچی میں حالات خراب ہوتے چلے گئے۔ ہمارے گھر کے چاروں طرف کی دیواریں اونچی ہو گئیں۔ کچھ عرصے بعد یہ بھی ناکافی ہو گئیں تو ان اونچی دیواروں کے اوپر لوہے کے نوکیلے تیر گاڑ دیئے گئے۔ پھر جب ڈاکے اور اغوا دن دہاڑے ہونے لگے تو گھر کے باہر ٹی وی کیمرہ اور دروازہ کا فون۔ کوئی باہر سے آ کر گھنٹی بجائے تو ہم اور نوکر، سب ہی پہلے تو پوری سڑک کی فلم اندر سے دیکھیں، پھر آنے والے سے بات

کریں۔ اگر اطمینان ہو تو کوئی دروازہ کھولنے گھر سے نکل کر گھر اور گھر کی اس اونچی دیوار کے درمیان جائے تاکہ سامنے کا بڑا دروازہ کھولا جائے۔ ڈاکے پڑیں تو لوگ پولیس کو بلاتے تھے، اور جب پولیس آتی تھی تو لوگ حیران ہو جاتے تھے کہ یہی پولیس والے ابھی ڈاکوؤں کی وردی میں اس گھر سے ہو کر گئے تھے۔ کوئی اپنا کام سمیٹ کر پنجاب جا رہا تھا تو کوئی امریکہ۔ لوگ اتنے غیر مطمئن ہوں تو ترقی کے بارے میں کون سوچ سکتا ہے۔ اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے رعنا اور قمر نے کینیڈا میں ہجرت کا سامان کیا اور دونوں کے ہجرت کے کاغذات منظوری کے بعد جلد ہی آ گئے کیونکہ قمر نے ایک کینیڈین وکیل کیا تھا جو بہت اچھا سمجھا جاتا تھا۔ ہم نے بھی یہاں سے روانگی کا ارادہ کیا۔ لیکن چلنے سے پہلے اپنی شاعری کے مجموعہ ''معراجِ وفا'' کی طباعت پر کام کرنا تھا۔ کتابت کے لئے کمپیوٹر پر کام ہوا۔ بہت جلدی کرنے کے بعد بھی ہمیں یہ کتاب ۶ر جولائی کو ملی جبکہ ۷ر جولائی کو ہمیں امریکہ کے لئے سوار ہونا تھا۔

۶ر جولائی ۱۹۹۶ء کو ہم پھر پی آئی اے سے نیویارک سوار ہو رہے تھے۔ اس مرتبہ ہمارے لئے وہیل چیئر کا انتظام کیا گیا تھا۔ کراچی کے ہوائی اڈے پر ان چیزوں کی کمی ہوتی تھی لہذا کچھ انتظار کرنا پڑا۔ اس سفر میں ہمیں خیال آتے رہے کہ انسان دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ کہاں ہم اپنے بچوں اور اپنے سامان کو خود لے کر یہاں سے وہاں آتے جاتے رہتے تھے، کہاں اب انتظار کر رہے تھے کہ وہیل چیئر آئے تو جایا جائے۔ پہلے سامان ایئرپورٹ کی بیلٹ سے خود ہی اتار لیتے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ آس پاس والوں سے کہہ کر سامان اتروانے لگے۔ کسی سے کہتے کہ وہ سامنے نیلے رنگ کا سوٹ کیس ہمارا ہے تو وہ فوراً کہتے، ''اچھا باجی، یہ لیں''۔ باجی سے ہم آنٹی ہو گئے، اور پھر ''امی جی یہ لیجئے'' کی آوازیں آنے لگیں۔ رشتے بدلتے رہے، بیٹی، بہن جی، باجی، اور امی۔ اب اس دفعہ جب وہیل چیئر آئی تو لانے والے صاحبزادے نے بڑی سعادتمندی سے فرمایا، ''آئیں اماں جی، میں آپ کو لے چلوں''۔

؎ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

اندر پہنچے، سامان اور بورڈنگ پاس سے فارغ ہوئے اور قائدِ اعظم بین الاقوامی ہوائی اڈّے کے خروج (امیگریشن) کے افسر سے اپنے پاکستانی پاسپورٹ پر اخراج کی مہر لگوائی تو ایسا لگا کہ یہ امریکی مہر ہو۔ بہت نفیس مہر تھی اور اس پر گھسیٹا مار دستکاری بھی کوئی نہیں تھی۔ طبیعت خوش ہو گئی۔

حسبِ معمول پی آئی اے کے کارکن امریکہ کے مسافروں کی کچھ زیادہ ہی سختی سے جانچ پڑتال کر رہے تھے۔ ایک جوڑے کو روکا ہوا تھا جن کا نکاح نامہ اُن کے سوٹ کیس کے ساتھ جہاز پر جا چکا تھا اور اب ان کے ویزے پر شک کیا جا رہا تھا لہٰذا نکاح نامہ کی ضرورت تھی۔ سامان واپس جہاز سے اترا، انہیں دیا گیا اور کاغذات جانچے گئے۔ ایک ہنگامہ رہا اور پرواز ساڑھے تین گھنٹے دیر سے روانہ ہوئی۔ اس ایک کاغذ کی وجہ سے پورا جہاز اور اس کا عملہ ساڑھے تین گھنٹے ضائع کر دے تو بھلا پی آئی اے کیسے منافع کما سکتی ہو گی۔ مگر امریکی طاقت طاغوتی ہے اور اس سے کوئی منکر نہیں ہوسکتا۔ پھر بھی طیارے نے نیویارک پہنچتے پہنچتے اِس دیر کو ایک گھنٹے کی دیر میں بدل دیا، غالباً سارے راستے کراچی کی بسوں کی طرح ''دبی رکھ استاد'' کرتے ہوئے ہوائی جہاز اڑایا تھا۔

نیویارک میں اپنی بھتیجی کے گھر پہنچتے پہنچتے ہمیں شام کے ۶ بج گئے۔ یہ ۱۸ صفر کا دن تھا اور ہم نے امام حسینؑ کا چہلم نیویارک ہی میں کیا۔ یہاں اس دن ایک چھوٹا جلوس نکلا جو صرف کوئنز کی سڑک سے گزرا تھا۔ ویسے یہاں عاشورہ کا جلوس بڑا ہوتا ہے جس کی ہم نے وڈیو دیکھی تھی تو لگتا تھا کہ جیسے کراچی میں نشتر پارک میں سے گزر رہا ہو۔

کراچی کے ماتمی جلوس ۱۹۷۲ء۔ اس میں ہمارے شوہر ذاکر حسین نقوی اور ہمارے بیٹے نجم بھی شامل ہیں

ہم نیویارک میں تین دن رکے اور اس دوران ہم نے پہلی مرتبہ نیویارک شہر دیکھا۔ یہاں کی عمارات، امپائر اسٹیٹ بلڈنگ اور ٹوین ٹاورز دیکھے۔ ہمارے ساتھ سیما کی نند شاہانہ نقوی اور نندوئی ڈاکٹر قنبر نقوی بھی تھے جو یہاں لانگ آئیلینڈ میں نفسیات کے ڈاکٹر تھے اور یہی ہمیں نیویارک دکھانے کی ذمّہ داری لے بیٹھے تھے سو ہم ان کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے تاکہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مقامات دیکھے جائیں۔ ایک فیری لے کر اسٹیچو آف لبرٹی گئے۔ اس کے بارے میں ہمیں پتہ چلا کہ یہ مجسمہ دراصل مصر کی نہر سوئز کے منہ پر پورٹ سعید میں لگانے کے لئے بنایا گیا تھا لیکن جب مصر کے شاہ سعید کے پاس پیسے نہیں رہے تو فرانسیسیوں نے وہاں کے بجائے سیاسی چال کے تحت یہ مجسمہ امریکہ کو تحفہ میں دے دیا تھا۔ اس مجسمہ کے اندر سیڑھیاں ہیں جو اوپر مجسمہ کے تاج تک جاتی ہیں جس میں کھڑکیاں بنی ہوئی ہیں۔ اس زمانے میں یہ سیڑھیاں کھلی تھیں اور ہم اوپر تک جا سکے تھے۔ بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ یہ سیڑھیاں بند کر دی گئی ہیں۔ ہم شام تک یہاں رہے اور اتنے میں بارش کا سماں ہونے لگا تو ہم سب گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

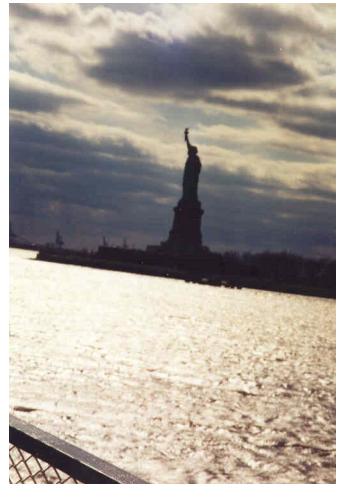

نیویارک: اسٹیچو آف لبرٹی کی یہ خوبصورت تصویر ہمارے بیٹے اعجاز نے کھینچی تھی۔

تین دن نیویارک میں گزار کر ۱۱ر جولائی کو ہم یونائیٹیڈ ایئر لائنز سے سان فرانسسکو واپس پہنچ گئے۔ پاکستانی پاسپورٹ پر یہ ہمارا آخری سفر تھا۔